حافظ لدھیانوی

دلوں کو چیر گئی اس کی شوخیٔ گفتار

اپنے ملتان کے قیام میں، میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کی ادبی، علمی، مذہبی اور روحانی صحبتوں سے مستفیض ہوا۔ علم و ادب کے بے شمار گوشے آداب و اخلاق کے کئی پہلو سامنے آئے۔ بزرگان دین علمائے کرام کے علم و فضل، طہارت و تقویٰ، زہد و ورع اور روحانی کمالات کی کئی داستانیں شاہ جی رحمہ اللہ علیہ کی زبانی سنیں۔ قلب و ذہن کو منور کیا۔ ماضی کے نقوش حال کے آئینے میں جلوہ گر ہوتے رہے۔ شاہ جی رحمہ اللہ کی صحبتوں میں گزرے ہوئے لمحات بیتے دنوں کے روشن چراغ تھے۔ جو افق ذہن پر قطار اندر قطار روشن ہوتے گئے۔ وہ علمائے کرام اور بزرگان دین کا ذکر انتہائی عقیدت اور ادب سے کرتے۔ گفتگو کرتے وقت شاہ جی رحمہ اللہ کے وجود پر ان بزرگان دین کے فیضان کے اثرات نمایاں ہو جاتے۔ سیاسی رہنماؤں کے قصے ان کی بے لوث خدمت ان کی قربانیاں ان کا بے پناہ ایثار سب کچھ شاہ جی رحمہ اللہ سے سنا۔ ایک ایک جملہ کتاب کا درجہ رکھتا تھا مشاہدے کی باتیں تھیں۔ دیکھے ہوئے واقعات تھے۔ سامنے گزری ہوئی داستانیں تھیں۔ اگر ان سب کو تحریر کروں تو الگ ایک کتاب کا موضوع بنتا ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ زندگی میں روشنیاں زیادہ ہیں۔ اندھیرے کم ہیں روشنی میرے ارد گرد پھیلتی ہے۔ میری رہنمائی کرتی ہے۔ میری ذات کی تاریکی کو روشنی میں بدل دیتی ہے۔ ان صحبتوں سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان بزرگوں کے قرب سے ان کی گفتگو سے ان کی پاکیزہ زندگی سے ان کے علمی کمالات سے اکتساب روحانی کرتا ہے۔ یوں تو ہر بزرگ اپنے دامن کرم میں ایسے ایسے گلہائے رنگا رنگ رکھتا ہے جس سے قلب مطمئن اور ذہن آسودہ ہو جاتا ہے۔ جو ان کے باطنی کمالات کا حصہ ہوتا ہے۔

بعض مجالس ایسی ہوتی ہیں جن کی یاد سے کتاب زندگی کے اوراق تابندہ رہتے ہیں۔ یہ مجالس ان علماء، ادباء اور اہل دل حضرات کی ہوتی ہیں جنکا ہر جملہ ادب پارہ، ہر لفظ حکمت کا گوہر اور ہر بات تاریخ ساز ہوتی ہے۔ عام گفتگو ہو یا علمی تبصرہ۔ سیاست کا عنوان ہو یا دینی مسائل پر اظہار خیال، شعر و ادب موضوع بحث ہو یا ذاتی واقعات و مشاہدات۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو ان کے ایک ایک جملے سے علم و ادب کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ ہر جملہ ان کے علمی تبحر، شعری ذوق، حسن بیان اور دلکش اسلوب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایسی علمی و ادبی مجالس میں شرکت ادب عالیہ کی درجنوں کتابیں پڑھنے سے زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ مجھے زندگی میں جید علماء، ممتاز دانشور، معروف شعراء، مستند رہنما اور روحانی پیشوا کی صحبتوں سے مستفیض ہونے ان سے اکتساب علم کرنے کے بیشمار مواقع میسر آئے۔ ادبی انجمنوں، تنقیدی اجلاس اور ہندوستان گیر مشاعروں میں شریک ہوا۔ داد کا اعزاز نصیب رہا۔ بزرگوں کی صحبتوں نے میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی آداب و اخلاق کے قرینے سمجھ میں آئے۔ مجلسی زندگی کے نئے رخ سامنے آئے مگر جو لطف جو کیف سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ

اللہ علیہ کی صحبت میں نصیب ہوا وہ سب سے منفرد تھا شاہ جی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ایک پیکر میں ہزار رنگ، ایک وجود میں بے شمار صفات ایک شخص متضاد علوم و فنون کا شاہکار تھا۔ اگر سیاست کی بات ہو تو ان کا انداز فکر جداگانہ۔ دین پر اظہار خیال ہو تو الگ طرز بیان سب سے الگ۔ شاعری موضوع گفتگو ہو تو ان کا شعری ذوق سب سے منفرد تھا۔ ان میں انفرادیت بدرجۂ اتم موجود تھی وہ ہر مسئلے کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شعر فہمی و ہی ہے۔ ہر ممتاز شاعر اچھا شعر فہم نہیں ہوتا۔ یہ ملکہ خداداد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو ایسی شعری بصیرت اور کمال ذوق سے نوازا تھا جس میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا خوبصورت شعر سنتے ہی اس کی اس حسین انداز سے تشریح فرماتے کہ اہل ادب حضرات ان کی شعر فہمی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ شاہ جی کے داد دینے کا انداز سب سے نرالا اور مختلف تھا۔ شاعر شاہ جی کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی بناوٹ سے شعر کا معیار پرکھ سکتا تھا۔ شعر کے معانی اور محاسن ان کے چہرے پر بکھرتے نظر آتے جیسے پھول کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ ایسی حسین داد وہی دے سکتا ہے جو شعر کی روح سے واقف ہو اور اس کی نزاکتوں سے کماحقہ آگاہ ہو لطافت شعر بے ہنگم داد کی بھی تو متحمل نہیں ہو سکتی۔ شاہ جی کی پسند اور ناپسند سند کا درجہ رکھتی تھی شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل ہے شعر فہمی میں خداوند کریم نے اپنی عطائے خاص سے شاہ جی کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

شعر فہمی کا تعلق ایک خاص وجدانی کیفیت سے ہوتا ہے۔ یہ وجدانی کیفیت ہر شخص کا ورثہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کا ادبی ماحول، روحانی لطافت، پاکیزگی خیال اور حسن مطالعہ درکار ہوتا ہے۔

جب شاہ جی لاہور تشریف لاتے تو ان کی قیام گاہ (دفتر مجلس احرار اسلام) پر لاہور کے ممتاز شعراء حاضری دیتے ان شعراء میں صوفی تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش، حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر جیسے اہل علم ہوتے۔ شاہ جی کی قیام گاہ اچھے خاصے مشاعرے میں تبدیل ہو جاتی اور شاہ جی اس ادبی و شعری انجمن کے روح رواں ہوتے۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی کہ شاہ جی کسی شعر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں اور وہ اس کے لئے ادبی سند بن جائے۔

شاہ جی غالب کی شاعری کو سراہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ "غالب تو جنت ہے اپنے ذوق کو کیا کروں اس سے کم درجے کا شاعر میرے مذاق سخن پر پورا ہی نہیں اترتا" شاہ جی کو غالب کے فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ جب کبھی اس گل کدے کا دروازہ کھولتے تو انجمن مہک مہک جاتی۔ گل تازہ کا حسن اور خوشبو دیدہ و دل کو منور کر جاتا۔ شاہ جی کے شعر پڑھنے کا انداز کوئی نہ اپنا سکا۔ شاہ جی کو خداوند کریم نے حسن صوت اور کمال ادائیگی سے نوازا تھا۔ شعر اس انداز سے پڑھتے کہ معانی اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے۔ شعر کا حسن رگ و پے میں سرایت کرتا اور ذہن و خیال کو تازگی بخشتا ہوا گزر جاتا۔ شاہ جی کا شعری انتخاب مثالی تھا۔ کوئی شعر معیار سے گرا ہوا لطافتوں سے معرا شاہ جی کی زبان سے نہیں سنا۔ ہر شعر فنی عروج اور حسن خیال کا شاہکار ہوتا۔

قحط بنگال پر نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ساحر لدھیانوی نے نظم "بنگال" لکھی جو کسی ساتھی نے شاہ جی کو پڑھ کر سنائی شاہ جی روزنامہ "آزاد" کے دفتر لاہور میں مقیم تھے۔ آپ نے نظم سنتے ہی فی البدیہہ شعر کہا اتفاقاً چند دنوں بعد ساحر چند دوستوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور نظم "بنگال" سنائی۔ ساحر کی نظم کے ایک بند کا شعر یہ تھا۔

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

شاہ جی ساحر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے؟ ساحر نے جواب دیا کہ وہ نہیں ہو سکا۔ اس پر شاہ جی نے اپنا یہ شعر سنایا۔ اور فرمایا۔ ساحر! یہ شعر تمہاری نذر کرتا ہوں۔

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

ساحر نے بہ اشتیاق و عقیدت قبول کر کے اسے اپنی نظم کا حصہ بنا لیا۔

شاہ جی نے فارسی اور اردو میں شعر کہے۔ جلسے جلوسوں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ اس فن کو باقاعدہ اپناتے۔ چیدہ چیدہ اشعار کہے جو ان کے جانشین برادرم سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ نے "سواطع الالہام" کے نام سے شائع کر دیئے۔ شاہ جی کا فارسی کا بے پناہ مطالعہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں فارسی اشعار از بر تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا معروف فارسی شاعر ہو جس کے اشعار شاہ جی کو یاد نہ ہوں۔ اگر شاہ جی شاعری کو اپناتے تو اس دور کے عظیم شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔ مگر شاہ جی کی عدیم الفرصتی نے انہیں اس طرف پوری طرح متوجہ نہ ہونے دیا۔

ایک دفعہ شاہ جی نے فرمایا کہ بچپن پٹنہ عظیم آباد میں گزرا شاد عظیم آبادی جیسا قادر الکلام شاعر محاورے اور روزمرہ کی تصحیح کے لئے ہمارے گھرانے کی طرف رجوع کرتا تھا۔ ایسی علمی ادبی اور دینی فضا میں شاہ جی کا بچپن گزرا۔ علماء کی صحبت سے مستفیض ہوئے گھریلو تربیت اور دین کے حصول نے اخلاق و آداب کے دروازے کھول دیئے۔

زبان و بیان پر شاہ جی کو قدرت کاملہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے جہاں تقریر کی اہل زبان حضرات سے داد وصول کی۔ لکھنؤ میں جلسہ ہو یا دہلی میں اہل زبان حضرات نے میری زبان کو سند مانا میرے کسی جملے یا لفظ پر کبھی اعتراض نہیں کیا" شاہ جی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں بھی تقریر کے لئے تشریف لے جاتے اس علاقے کی زبان بلکہ لب و لہجہ میں تقریر کرتے۔ سامعین تک اپنی بات ان کے لب و لہجہ اور زبان میں پہنچانے سے زیادہ موثر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے شاہ جی کی تقریر خطابت کا شاہکار تھی۔ میں نے ان کی خطابت کے بارے میں اشعار کہے تھے۔

زبان ایسی فصاحت بھی جس پہ اترائے
کلام ایسا سنے جو بھی اس کو رشک آئے

ہر اک سخن میں دل سنگ کو گداز کرے
وہ جس پہ فن خطابت ہزار ناز کرے
تھی جس کے حسن تلاوت میں بارش انوار
دلوں کو چیر گئی اس کی شوخئ گفتار

اسی خطابت اسی فن تقریر میں کمال کی وجہ سے سیاسی رہنماؤں، علماء اور شعلہ بیان مقررین نے انہیں خطیب اعظم کے لقب سے یاد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور نے شاہ جی سے بڑا خطیب پیدا ہی نہیں کیا۔ ایک روز حفیظ جالندھری سے شاہ جی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حفیظ جالندھری نے عجیب و غریب جملہ فرمایا کہ "شاہ جی کی تقریر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی ماندہ معجزات میں سے ایک معجزہ تھی" اس جملے میں سرور کائنات ﷺ کے کرم کی جھلکیاں اور شاہ جی کے بخت کی معراج نظر آتی ہے۔

شاہ جی جس احترام، ذوق و شوق اور حسن تجوید کے ساتھ کلام پاک پڑھتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آواز میں سوز، اور لحن میں عجیب تاثیر رکھی تھی۔ شاہ جی کی تلاوت دلوں میں نور کی قندیلیں جلاتی، روحوں کو مجلّیٰ کرتی اور تطہیر قلب و نگاہ کرتی نظر آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ دلوں کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ پاکیزگی کی فضا قائم ہو رہی ہے۔ یہ تاثیر یہ انداز یہ کمال شاہ جی کے ذاتی تقدس قرآن مجید سے شیفتگی اور احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ تھا۔ شاہ جی کی تلاوت سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ دوسرے مذاہب کے لوگ شاہ جی کی تلاوت سننے کے لئے جلسہ گاہ میں آتے تھے۔ اس ضمن میں شاہ جی نے ایک واقعہ بیان کیا۔

شاہ جی تہجد کے وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ ایک بندہ اپنے خدا سے ہم کلام تھا۔ دل کے خلوت کدے کو کلام الہیٰ کے نور سے منور کر رہا تھا۔ اس جیل کا جیلر ہندو تھا۔ شاہ جی کی آواز سن کر ان کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ شاہ جی کی آواز کے سوز نے اس میں رقت پیدا کر دی آخر اس نے شاہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا شاہ جی تلاوت بند کر دیجئے اب رویا بھی نہیں جاتا۔ شاہ جی نے مڑ کر دیکھا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

شاہ جی کی حسن قرأت کے اور بہت سے قصے ہیں، ایک واقعہ شاہ جی نے خود بیان کیا۔

دہلی میں ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اکابرین ملت، زعمائے کرام مقتدر سیاسی رہنما کانگرسی لیڈر اور معروف مقررین موجود تھے۔ مجمع کسی مسئلے پر متفق نہ تھا۔ مخالف گروہ کی اکثریت تھی وہ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لئے جلسہ درہم برہم کرنے کو تیار تھے وہ کسی مقرر کی تقریر سننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تک کو انہوں نے تقریر نہ کرنے دی۔ ابوالکلام آزاد نے مجمع کی یہ کیفیت دیکھی تو ان کی نگاہ انتخاب شاہ جی پر پڑی۔ ان کو معلوم تھا کہ شاہ جی عوام کی نفسیات سے واقف ہیں وہ کسی نہ کسی طرح مجمع کو قابو میں کر لیں گے۔ ابوالکلام آزاد نے شاہ جی کو تقریر کرنے کو کہا۔ تعمیل میں شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاحد نظر اُمڈے ہوئے تند و تیز سیلاب کو دیکھا۔ شاہ جی نے تلاوت شروع کی جلسہ گاہ میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ کلام

پاک کی تلاوت کی مجمع شاہ جی کے حسن قرأت میں اپنا موقف بھول گیا۔ شاہ جی خدائے بزرگ و برتر کی آخری کتاب کی تلاوت کر رہے تھے لوگوں کے چہروں سے مخالفت کا غبار دھل رہا تھا۔ جذبات کے شعلے مدھم ہو گئے۔ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلسہ گاہ میں مکمل سکوت تھا۔ ہر شخص شاہ جی کی تلاوت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے کلام پاک کی تلاوت اور خطبہ مسنونہ ... کے بعد تقریر کا آغاز کیا۔ شاہ جی کی تلاوت نے دلوں کو نرم کر دیا۔ وہی مجمع جو کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے آیا تھا۔ زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ شاہ جی نے تفصیل کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا اور اپنے نظریئے کی وضاحت کر کے مخالف گروہ کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ شاہ جی نے ایسے کئی معرکے سر کئے جن کی تفصیل کے لئے ضخیم کتاب درکار ہے۔

ایک روز میں نے شاہ جی سے سوال کیا کہ آپ نے فن تجوید و قرأت کس سے سیکھا۔ شاہ جی اس سوال پر مسکرائے فرمایا۔ یہ بہت عجیب و غریب واقعہ ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہمارے پٹنے میں ایک عرب تھے۔ وہ بچوں کو قرأت کا درس دیا کرتے تھے۔ میں ان کی قرأت کو غور سے سنتا اور گھر آ کر انہی نقل اتارتا۔ ایک روز میں مسجد کے حجرے میں ان کی نقل اتار رہا تھا وہ عرب قاری (عمر عاصم) باہر غور سے میری تلاوت سنتے رہے۔ جب میں تلاوت کر چکا اندر حجرے میں آئے ان کی اچانک آمد سے میں حواس باختہ ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سوال کیا تم نے فن تجوید کس سے سیکھا میں نے حواس مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں تو آپ کی نقل اتار رہا تھا۔ اس عرب قاری نے فرمایا "تم سارق الطبع ہو" شاہ جی نے فرمایا بس میرے فن تجوید میں سماعت ہی کو دخل ہے۔

شاہ جی کا سب سے بڑا وصف حاضر دماغی اور حاضر جوابی تھا۔ جلسے میں کوئی سوال کیا جائے شاہ جی نہایت سکون اور وضاحت کے ساتھ اس کا برجستہ اور مسکت جواب دیتے تھے۔ سوال کرنے والے کی تسلی ہو جاتی تھی۔ اس کو مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ لاکھوں کے مجمع میں مخالفین نے شاہ جی سے سوال کئے اور شاہ جی کے چند جملوں نے انہی تشفی کر دی۔

شاہ جی کی تقریر سننے اس سے مستفیض ہونے کے لئے علمائے کرام مفسرین، مقررین، سیاسی رہنما، اہل ادب، اہل ذوق حضرات اور عوام الناس سبھی قسم کے لوگ آتے تھے۔ حسن خطابت کا کمال یہ تھا کہ دس دس گھنٹے شاہ جی تقریر کرتے اور مجمع میں سے ایک شخص بھی اٹھ کر نہ جاتا۔ شاہ جی جب چاہتے مجمع کو رلاتے جب چاہتے ہنساتے۔ گویا لاکھوں اشخاص کی نبضوں پر شاہ جی کا ہاتھ تھا۔ وہ عوام کے چہروں سے عنوانات چن کر تقریر سجاتے۔ ان کی تقریر ایک ان پڑھ کے لئے اتنی ہی پر کشش تھی جتنی ایک عالم کے لئے۔ ایک مفسر قرآن بھی آیات کریمہ کے ترجمے اور نکات سے محظوظ ہو رہا ہے اور ایک ادیب اور شاعر بھی شعر کے برجستہ استعمال سے مسحور ہو رہا ہے۔ ہر ایک کا دامن بھرا جا رہا ہے لوگ کیسۂ دل میں یادوں کے انمول موتی لے کر لوٹتے۔ حاضر جوابی کے سلسلے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی سے ایک پر لطف واقعہ سنا ڈیرہ غازی خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا شاہ جی کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہزاروں معتقدین شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے آئے۔ مضافات میں سے میلوں پیدل چل کر جلسہ میں شرکت کی غرض سے آئے۔ اس علاقے کے لوگ

بزرگان دین کے مزاروں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ عقیدت کا جذبہ شرک کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ یہ عقیدت یہ مزاروں سے قلبی وابستگی ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہے۔

شاہ جی کی تقریر کے آغاز ہی میں کسی نے مزاروں پر حاضری اور مزاروں کے جواز کے بارے میں استفسار کر دیا۔ ان دنوں سعودی عرب میں شاہ سعود مزارات کے قبوں کو مسمار کر رہے تھے۔ قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میں حیران تھا کہ شاہ جی اس نازک مرحلے سے کس طرح نکل سکیں گے۔ اگر مزاروں کے خلاف بات کرتے ہیں تو جلسہ گاہ میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا اگر ان کے نظریات کی تائید کرتے ہیں تو عقیدے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن تھا۔ سوال کرنے والے نے یہ بھی کہہ دیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تو مدینہ منورہ میں مزار ہے۔ شاہ جی نے اس نوجوان سے پوچھا کہ کیا واقعی جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک ہے۔ مجمع اس سوال پر حیران تھا کہ وہی روضہ اطہر تو قلوب کی تسکین کا مرکز، انوار کا سرچشمہ، پناہ عالمیاں اور تشنہ نگاہوں کی سیرابی کا نشان ہے۔ شاہ جی نے خطابت کے انداز میں جواب دیا کہ جب میرے آقا کائنات کے آقا کا مزار مقدس موجود ہے تو دوسرے مزار کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ شرک فی النبوۃ ہے۔ یہ بات کچھ اس انداز سے بیان کی کہ مجمع اسیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ اپنا عقیدہ اور مسلک بھول گئے۔

شاہ جی کی تقریر مزاج کو بدل دیتی تھی۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ اعتقادات میں انقلاب برپا کر دیتی تھی۔ لوگ شاہ جی کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ یہ زور بیان، یہ حسن خطابت، یہ انداز کلام بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

شاہ جی کی خطابت کا ایک اور معرکہ برادر محترم اعجاز احمد چشتی نے بیان کیا۔ اعجاز احمد چشتی گارڈن کالج راولپنڈی میں زیر تعلیم تھے۔ شاہ جی کی تقریر کا اعلان ہوا چشتی صاحب کے کچھ دوست کمیونسٹ ذہن کے تھے۔ چشتی صاحب نے انہیں تقریر سننے پر آمادہ کر لیا۔ وہ چشتی صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچے وہ اپنے ذہنوں میں بہت سے سوال لے کر آئے تھے کہ وہ دوران تقریر اپنے نظریئے کے مطابق شاہ جی سے سیاسی نوعیت کے سوال کریں گے۔ ان کو اپنے مطالعے، اپنے نظریے پر ناز تھا۔ وہ تمام مسائل کا حل کمیونزم سمجھتے تھے۔ ملحدانہ عقائد نے ان کے ذہنوں کو مسخ کر دیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ لوگ بے تابی سے شاہ جی کی آمد کے منتظر تھے۔ شاہ جی پنڈال میں داخل ہوئے ہزاروں عقیدت مند نگاہیں ان کے استقبال کے لئے اٹھیں شاہ جی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے شاہ جی نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی مجمع خاموش ہو گیا۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی نے تقریر کا آغاز کیا۔ وہ کمیونسٹ طلباء محو حیرت بنے ہوئے شاہ جی کی تقریر سن رہے تھے۔ سوالات کا نقشہ ذہن سے محو ہو گیا۔ ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ ایک موج خطابت تھی کہ بہائے لئے جا رہی تھی۔ ایک سوز تھا کہ دل کے خلوت کدے روشن کر رہا تھا۔ خداوند کریم کے آخری پیغام کی تشریح و تفسیر ہو رہی تھی۔ دلوں کی سیاہی دھل رہی تھی۔ دلوں کا زنگ دور ہو رہا تھا۔ اعجاز احمد چشتی صاحب کا بیان ہے کہ جلسہ گاہ میں سب سے زیادہ رونے والے یہی کمیونسٹ طلباء تھے۔ جو اعتراضات کے کانٹے

لے کر آئے۔ عقیدت و محبت کے پھول لے کر لوٹے۔

شیخ حسام الدین احرار کے سر کردہ لیڈروں میں سے تھے۔ شعر و ادب کے دلدادہ، باوضع و باوقار انسان، تقریر میں گرج، مجلسی گفتگو میں لطافت، آزادی کا بے باک و نڈر سپاہی۔ زندگی کی نصف صدی کی داستانوں، واقعات و حادثات، سیاسی کشمکش، قید و بند کے حالت دار و رسن کے قصے، انگریزوں کے مظالم، جدوجہد آزادی کی تفسیر۔ یعنی شیخ صاحب کی ذات تاریخ کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ دوران گفتگو مجلس احرار کے معرکوں، خطابت کے انداز، مقتدر سیاسی شخصیتوں کے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو تاریخ کے اوراق کھل جاتے۔

ایک دن دوران گفتگو سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو امیر شریعت کا لقب ملنے کا واقعہ شیخ حسام الدین رحمہ اللہ کی زبانی سنا۔ شیخ صاحب اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ آپ نے فرمایا۔

شیرانوالہ گیٹ میں مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ نے انجمن خدام الدین کا سالانہ جلسہ منعقد کیا۔ جس میں ہندوستان بھر کے پانچ سو علماء جمع تھے۔ ان دنوں قادیانی تحریک زوروں پر تھی۔ حکومت افرنگیہ اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ جیسے بزرگان دین بھی موجود تھے۔ علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ قادیانی فتنے کے رد کے لئے اس کی نشر و اشاعت کو روکنے کے لئے لوگوں کو بے دینی سے بچانے کے لئے ہمیں ایک امیر منتخب کر لینا چاہیئے تاکہ منظم طریقے سے اس فتنے کا سد باب کیا جا سکے۔ حضرت رحمہ اللہ کی رائے سے تمام علمائے کرام نے اتفاق کیا اور بیک زبان ہو کر کہا کہ آپ ہم سب میں بزرگ، سب سے زیادہ محترم و مکرم ہیں۔ آپ جو فیصلہ فرمائیں گے ہمیں منظور ہو گا۔

علامہ محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شاہ جی کو طلب کیا شاہ جی لپک کر حاضر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں اس کام کے لئے آپکے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور امیر شریعت کا لقب عطا فرمایا۔ شاہ جی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بزرگ جس کی علمیت، جس کی بزرگی، جس کے تقویٰ کا ہر شخص معترف تھا۔ جو تمام علماء کا مخدوم تھا جس کی دینی خدمات بے مثل تھیں۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ ختم نبوت اور ناموس کی خاطر ایک نوجوان عالم دین کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کے بعد پانچ سو کے قریب علمائے دین، مفسرین، محدثین نے رد مرزائیت کے سلسلے میں شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر حضرت انور شاہ کاشمیری قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ "خداوند کریم نے اس عظیم کام کے لئے آپ کو منتخب کر لیا ہے۔ اس کار خیر کی سعادت آپ کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے"

شاہ جی نے اس لقب کی لاج رکھ لی۔ سینکڑوں اجتماعات سے اس مسئلہ پر پرزور تقریریں کیں۔ اس جھوٹے مدعی نبوت کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچا لیا۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے اس دینی خدمت کے لئے ساری زندگی وقف کر دی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اس محاذ پر لڑے۔ قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ آخر ان کی سعی جمیلہ، ان کی عمر بھر کی کاوش بار آور ہوئی اور مرزائیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا۔ اور حکومت نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دے کر اس مسئلہ کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

شاہ جی علمائے کرام اور بزرگان دین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب کسی بزرگ کا ذکر کرتے تو ادب و احترام کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر ذکر کرتے۔ شاہ جی احرار کے دفتر لاہور میں تشریف فرما تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ شاعری کا دور ہو رہا تھا۔ شورش کاشمیری نے اپنی گفتگو سے محفل کو زعفران بنا رکھا تھا۔ اچانک کسی نے مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی نور اللہ مرقدہ کی آمد کی اطلاع دی۔ محفل کا رنگ یکسر بدل گیا۔ ہر شخص احترام و عقیدت کا پیکر بن گیا۔ شاہ جی نے آگے بڑھکر حضرت کا استقبال کیا۔ اور نہایت ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے حضرت تشریف فرما ہوئے۔ شاہ جی سے فرمایا کہ تشریف رکھئے شاہ جی دو زانو ہو کر نظریں جھکا کر حضرت کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ جب تک حضرت احمد علی رحمہ اللہ تشریف فرما رہے شاہ جی اسی انداز سے بیٹھے ادب و احترام سے ان کے ارشادات سنتے رہے۔

اسی طرح شاہ جی کو اپنے مرشد و مربی حضرت عبد القادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کی مجلس میں مؤدب بیٹھے دیکھا لاکھوں کے مجمع کو اپنی خطابت سے مسحور کرنے والا، ہر جگہ زبان و بیان کا جادو جگانے والا، خطیب اعظم شعلہ بیان مقرر خاموشی و عقیدت سے سر جھکائے حضرت رحمہ اللہ کی خدمت اقدس میں حاضری دیتا۔ آداب کے تمام تقاضے احترام کے تمام پہلو، نیاز مندی کے تمام رخ سامنے آجاتے۔ اگر حضرت رحمہ اللہ کوئی بات دریافت فرماتے تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

جالندھر میں خیر المدارس کا جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ مدرسے میں جگہ ناکافی ہونے کی وجہ سے جلسے کا انتظام کمپنی باغ میں کیا گیا۔ یہ کمپنی باغ شہر میں واقع تھا۔ اور سیر کی بہترین جگہ تھی۔ نماز جمعہ کے بعد جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہوا چند علماء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مدرسے کی دینی خدمت کو سراہا مولانا خیر محمد نور اللہ مرقدہ کی ذات بابرکات کو خراج تحسین ادا کیا۔ سب سے آخر سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا خطاب تھا حد نگاہ تک لوگوں کا مجمع تھا۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ شروع کیا ہی تھا کہ کسی نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ ہزاروں لوگوں کے سروں پر مکھیوں نے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ شاہ جی نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے پتھروں کی طرح جم کر بیٹھے رہو۔ شاہ جی کے چہرے پر مکھیوں نے ڈنگ مارنا شروع کر دیئے شاہ جی نے فرمایا کہ چہرے کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں مکھی نے ڈنگ نہ مارا ہو۔ میں نہایت ضبط سے خطبہ پڑھتا رہا۔ ایک مکھی نے میری آنکھ کے کونے میں ڈنگ مارا۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔ مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اس نے دونوں ہاتھوں سے مکھیوں کو چہرے سے اتارا چہرہ سوج گیا۔ بخار کی شدت ہو گئی۔ لدھیانہ میں احرار کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ دوسرے روز شاہ جی اسی عالت میں لدھیانہ تشریف لائے۔ چہرہ بے حد سوج گیا تھا۔ تیز بخار تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز کی تقریر تھی۔ حضرت کرسی پر بیٹھے تقریر فرما رہے تھے۔ مجمع نہایت احترام سے آپ کے ارشادات گرامی سن رہا تھا۔ انوار کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک وجود گرامی جو دین کی تفسیر تھا۔ خداوند کریم کی آخری کتاب سے خداوند کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا تھا۔ احادیث نبوی کے حوالوں سے ساری مجلس دائرہ نورانیت میں آگئی۔ ایک آواز دلوں میں گھر

کر آ جا رہی تھی۔ حضرت کی گفتگو میں تقویٰ کا حسن، علم کی خوشبو، پاکیزگی کا جمال اور عمل کی لذت تھی جب حضرت تقریر ختم کر چکے تو شاہ جی فرط شوق و محبت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت کو بلیغ انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے۔ آپ کی تقریر کا ایک ایک لفظ میری سال بھر کی تقریروں کا موضوع بن گیا۔ آپ نے علماء کے ذہنوں میں علم کے چراغ روشن کر دیئے۔ آپ نے جس انداز سے قرآن مجید کی تعلیمات کو ہم تک پہنچایا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں تو حضرت کا خوشہ چین ہوں۔ غرضیکہ شاہ جی نے اپنی محبت و عقیدت کا حسین انداز میں اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ شاہ جی کو بزرگوں سے، اہل اللہ سے مقربان بارگاہ الٰہی سے انتہائی عقیدت تھی۔ یہ جملے بھی اسی عقیدت کے اظہار کی علامت تھے۔

ملتان کے دو سالہ قیام میں باقاعدگی سے شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ شاہ جی کے علمی خزانے سے دامن طلب بھرتا رہا۔ مختلف موضوعات پر شاہ جی کی گفتگو سنی۔ علمائے دین کی مجالس کی روئداد، ان کے علمی کمالات، ان کی بے لفسی ان کے تقویٰ کی داستانیں شاہ جی سناتے۔ مجلسی آداب کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتے۔ ایک روز اخلاق پر گفتگو فرماتے ہوئے کہا کہ "اخلاق کا سرچشمہ ادب کا مصدر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں ایک بار بھی مجلس میں لات پسار کر نہیں بیٹھے" بھر جذبے کے ساتھ فرمایا" حضور ایک بار لات پسار کر بیٹھتے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کے قدم مبارک کو آنکھوں سے لگاتے۔ ان کے پائے مبارک پر چہرے کو ملتے مگر اس معلم اخلاق اس سرچشمہ رشد و ہدایت سے ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

شاہ جی درویش صفت انسان تھے۔ سادہ زندگی بسر کی۔ ان کے دل میں دولت و ثروت کی کبھی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ہندوستان کا خطیب اعظم کرائے کے مکان میں رہا۔ جس میں برسوں سے قلعی نہ ہوئی تھی۔ جس کی مٹی گرتی رہتی تھی۔ اسی مکان میں ہندوستان بھر کے علماء شاہ جی کی ملاقات کے لئے آئے۔ اسی مکان میں شعر و ادب کی مجلسیں آراستہ ہوئیں۔ سرمایہ دار اسی ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر شاہ جی کے ارشادات سے مستفیض ہوئے۔ اس گھر کے دروازے رنگ و روغن سے بے نیاز رہے۔ خطیب اعظم کے گھر میں قالین نہ تھا۔ صوفے نہ تھے۔ دروازوں پر ریشمی پردے نہ تھے۔ ایک چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس میں نلکا لگا ہوا تھا۔ خطیب اعظم اسی غسلخانے میں نلکے سے پانی نکال کر غسل کرتا۔ اس غسل خانے میں مشکل سے غسل ہو سکتا تھا۔ اندر کے کمروں کا بھی یہی حال تھا۔ صحن کچا تھا۔ ایک روز میں نے شاہ جی کو حیدر دہلوی کا شعر سنایا۔

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ پھر اپنے گھر کے در و دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی۔

شاہ جی اگر چاہتے تو ایک تقریر میں ایک کوٹھی کے پیسے جمع کر سکتے تھے۔ لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں ہزاروں

روپیہ اکٹھا کرنا مشکل کام نہ تھا مگر شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے توکل اور غنا کی دولت سے نوازا تھا۔ انہوں نے مادی دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ فقر و فاقہ کو زندگی کا حسن بنایا۔ اگر شاہ جی دولت کمانا چاہتے تو آج پاکستان میں ان کے فرزندوں سے زیادہ امیر کوئی نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو علم کی دولت دی، دین سکھایا، دین پڑھایا، سب کو قرآن مجید حفظ کرایا اس سے زیادہ بہتر ورثہ کیا ہو سکتا ہے کہ اولاد کا ہر نیک عمل والدین کے درجات کی بلندی کا سبب بنے۔

شاہ جی کے مسلسل قرب سے ان کی ذاتی خوبیاں، ان کے زندگی کے بے شمار پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایسے بزرگوں میں سے تھے جن کے قرب سے ان کی عظمت کے مینار اور بلند نظر آتے ہیں۔ شاہ جی اوصاف کا پیکر جمیل تھے۔ شاہ جی کی مجلس میں گھنٹوں گزارے۔ شاہ جی نے تمام عمر کسی کی غیبت نہیں کی۔ یہ بظاہر بہت معمولی بات نظر آتی ہے مگر ہماری کوئی مجلس بھی غیبت سے مبرا نہیں۔ جہاں چند دوست اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی کی برائی، عیب جوئی ضرور درمیان میں آجاتی ہے۔ شاہ جی نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بھی کبھی غیر محتاط گفتگو نہیں کی۔ کسی کی ذات کے بارے میں نازیبا لفظ استعمال نہیں کئے۔ یہ ان کے اخلاق کا کمال اور ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ عالی ظرفی، یہ رکھ رکھاؤ، یہ وضعداری ان سے مختص تھی۔

شاہ جی کی زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ انہوں نے کسی حال میں بھی کسی معتقد کسی مرید یا کسی دوست کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ فقر کی شان ہے، یہ بے نیازی کی شان یہ غنا کا ورثہ، یہ توکل کی دولت انہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

ایک روز سکندر مرزا صدر پاکستان ملتان آئے شاہ جی کو پیغام بھیجا کہ اگر تشریف لاسکیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔ شاہ جی نے قاصد سے کہا کہ مجھے مرزا صاحب سے کوئی کام نہیں اگر وہ اس فقیر سے ملنا چاہتے ہیں تو دروازے کھلے ہیں بصد شوق تشریف لائیں۔

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

تیسری بات جس کا میں نے مشاہدہ کیا کہ شاہ جی نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا اگر کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہوتا تو اس کی وضاحت فرما دیتے۔ ایک روز شاہ جی حکیم حافظ حنیف اللہ صاحب کے مطب میں تھے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کی اہلیہ کی تیمارداری کے لئے جانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑی۔ زیادہ چل نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ گھر سے ارادہ کر کے نہیں نکلا تھا راستے میں خیال آیا تھا۔

حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مسلمان میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل دوسرے جھوٹ۔ شاہ جی کی زندگی ان دونوں برائیوں سے پاک صاف تھی۔

مولانا محمد یٰسین صاحب شاہ جی کے حلقۂ احباب میں سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں خانہ کعبہ کے سامنے راقم الحروف کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ بزرگان دین کا ذکر خیر ہوتا رہا۔ اسی گفتگو میں شاہ جی رحمہ اللہ کا ذکر خیر بھی آیا مولانا محمد یٰسین صاحب نے شاہ جی کی شفقت محبت اور حسن کردار کا عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔

مولانا کا تعلق ضلع جھنگ سے ہے اور ان کے خاندان کے کئی افراد یہیں آباد ہیں۔ مولانا نے بیان فرمایا کہ "ہیڈ تریموں کا بند ٹوٹ گیا اور سیلاب سے ایک وسیع علاقہ زیر آب آگیا۔ میرے بھائی کی زمین بھی اسی علاقے میں تھی۔ پانی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ بھائی کے مکان کے قریب تیس فٹ گہرا گڑھا پڑ گیا۔ اور مکان بہہ گیا۔ اس ہنگامی صورت حال میں بھائی نے خواتین کو محفوظ مقام تک پہنچایا۔ پھر چارپائی اور دوسرا کچھ سامان اٹھانے گئے۔ تو پانی کے شدید ریلے کی نذر ہو گئے اور اسی میں وفات پا گئے۔ میں ایک چھوٹی کشتی کے ذریعے خواتین کو لیکر علاقہ "واسووستانہ" پہنچا۔ کچھ دنوں بعد ملتان آیا تو بھائی کی اس حادثاتی موت پر سخت دل گرفتہ اور مغموم تھا۔ اسی حال میں اپنے پیر و مرشد اور مشفق و مربی حضرت امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شاہ جی کو حال دل سنا کر کچھ غم ہلکا کیا۔ میں نے واپس جانے کے لئے اجازت چاہی تو مجھے ایک طرف تخلیہ میں لے گئے۔ اور فرمایا میری جیب میں ہاتھ ڈالو۔ جیب میں پانچ سو روپے تھے۔ شاہ جی نے فرمایا انہیں اپنے اخراجات میں لانا۔ پھر فرمایا کہ معلوم ہے میں نے آپ کو جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ میرے دوست کو ہاتھ پھیلانے کی ذلت اور شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ یہ حسین انداز یہ محبت کا رخ یہ حسن اخلاق کی ادا شاہ جی ہی کی حسن تدبیر کا کرشمہ ہو سکتی تھی۔

میں نے شاہ جی کو ایک لاثانی خطیب، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک محفل آرا شخصیت ایک بلند پایہ ادیب، ایک جید عالم کے علاوہ ایک بلند کردار، راست باز، متوکل، ہمدرد اور دوست نواز شخص بھی پایا۔ یہ اوصاف یہ خوبیاں یہ وضع داریاں اسلاف کا ورثہ ہیں۔ یہ ورثہ اب نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی کی بیعت اول قطب دوراں حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز سے تھی۔ بعد میں وہ حضرت عبدالغفار رائے پوری نوراللہ مرقدہ کے دامن سعادت و کرم سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ جی نے حضرت اقدس سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کی خدمت میں نہایت ادب و احترام سے حاضری دیتے رہے۔ جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

ایک روز پنجابی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاہ جی رحمہ اللہ پنجابی زبان کی وسعت اس کی جدت اور اس کی بے ساختگی کی داد دے رہے تھے۔ شاہ جی نے پیر وارث شاہ سے چند اشعار بھی سنائے۔ دوسرے پنجابی شعراء کا تذکرہ رہا۔ راقم الحروف نے بھی میاں محمد رحمہ اللہ کے کچھ اشعار سنائے۔ صوفیائے کرام کی شاعری پر شاہ جی نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں جو سوز، رقت اور واردات قلبی کا اظہار ہے وہ دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ صوفیاء کی شاعری حال کی شاعری ہے۔ وہ اپنی کیفیات باطنی کو چند اشعار میں بیان کر کے اہل دل حضرات کو سوز کا بہت بڑا سرمایہ عطا کر جاتے ہیں۔ پنجابی کی مختلف اصناف شاعری کا ذکر رہا۔ آج کی مجلس پنجابی زبان کے بارے میں معلوماتی اور کیف آور مجلس تھی۔ دوران گفتگو شاہ جی نے پنجابی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ایک بلیغ جملہ ارشاد فرمایا "پنجابی زبان خیال کو آنگن دیتی ہے"۔

میں نے شاہ جی کو پنجابی کا ایک شعر سنایا۔

میری گھگھری نوں گھنگرو لوآ دے
جے توں میری ٹور ویکھنی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ مجھے اس شعر میں کوئی جدت یا ندرت خیال نظر نہ آئی۔ مجھے شاہ جی کی شعر فہمی کے بارے میں علم تھا خاموش رہا۔

حضرت اقدس حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہ فیصل آباد میں خالصہ کالج کی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ جی بیماری کی وجہ سے سفر کے قابل نہ تھے۔ نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت اقدس کے ارشاد پر شاہ جی کو کار بھیج کر بلوایا گیا۔ عصر کے بعد حسب معمول حضرت اقدس کی محفل جمی شاہ جی نے اپنی دھوتی کا پلو پکڑ کر حضرت اقدس سے مخاطب ہو کر شعر پڑھا۔ فرمایا حضرت ایک درخواست ہے۔ میرے بیٹے حافظ لدھیانوی نے شعر سنایا تھا۔ پھر اپنی مخصوص لے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ دو تین سو آدمی اشکبار ہو گئے۔ شاہ جی شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت اقدس پر بھی کیفیت طاری ہو گئی۔ شعر کی قسمت جاگ اٹھی اس ادائے خلوص و محبت، نیازمندی، حضرت اقدس سے وابستگی کے ہزار پہلو روشن کر دیئے۔

ابتداء میں شاہ جی کو روحانی فیض اپنے والد ماجد قدس سرہ کی نظر التفات اور خاص توجہ سے ملا۔ شاہ جی نے ایک روز فرمایا تھا۔ جب وہ چلتے تو درخت اور دیواریں انہیں پیچھے ہٹتی ہوئی معلوم ہوتیں اور بھی روحانی کمالات کا تذکرہ کیا۔ شاہ جی کی ساری زندگی تقویٰ، پرہیزگاری، درویشی اور توکل پر گزری، اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن و جمال کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ ان کی طبیعت دنیا کی طرف کبھی راغب ہی نہ ہوئی عشق رسول اللہ ﷺ نے ہر خواہش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کو اگر دھن تھی تو یہ کہ وہ حضور اکرم ﷺ کا پیغام زندگی جو ابدی نجات کا ذریعہ ہے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچا دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہزاروں تقریریں کیں۔ حضور اکرم ﷺ کے لاکھوں شیدائیوں کو حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ناموس اور تحفظ ختم نبوت پر جہاد بالا ان کیا۔ حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ نے جس مشن کے لئے آپ کا انتخاب کیا تھا اس کو تمام عمر بطریق احسن پورا کیا۔ شاہ جی نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے انگریزوں کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا جب مائیں اپنے بچوں کو انگریز کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اس حق گوئی و جذبہ حریت کی پاداش میں انہیں بارہا جیل جانا پڑا۔ مقدمات چلے۔ مگر انہوں نے ہزاروں کے مجمع میں انگریز کے خلاف تقاریر کیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

شاہ جی سے لاکھوں انسانوں کو بے پناہ عقیدت تھی۔ شاہ جی کا نام ان کے دل کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ شاہ جی کے لئے ہزاروں دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جو شاہ جی کی زبانی سنا تھا۔

لدھا رام حکومت کا رپورٹر تھا سر سکندر حیات کی حکومت نے شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کرا کے لدھا رام سے نئی رپورٹ لکھوائی یہ بہت بڑا مقدمہ تھا۔ اس مقدمے میں شاہ جی کو بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی تھی۔ آخری پیشی کے وقت لدھا رام نے شاہ جی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لدھا رام کا مردہ ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے برسر عدالت حقیقت کا انکشاف کر دیا اور عدالت میں بیان دیا کہ شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کر کے اس سے دوبارہ رپورٹ تیار کرائی گئی ہے۔ جو الزامات شاہ جی پر لگائے گئے ہیں وہ بے بنیاد، فرضی اور بعید از حقیقت ہیں۔ اس طرح شاہ جی تختہ دار تک پہنچ کر واپس آ گئے۔ (مقدمہ سے باعزت بری کر دیئے گئے) یہ ان دعاؤں کا نتیجہ تھا جو لاکھوں انسانوں نے بارگاہ رب العزت میں کی تھیں۔

شاہ جی نے فرمایا کہ میں ایک جلسے میں تقریر کر کے سٹیج سے نیچے اترا ایک ضعیفہ لاٹھی سے ٹیک لگائے راستے میں کھڑی تھی۔ جونہی میں اس کے پاس سے گزرا اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میرے قدم یکدم رک گئے۔ میں اس عفیفہ ضعیفہ کے قریب گیا۔ ادب سے سلام کیا۔ بڑھیا کہنے لگی عطاء اللہ شاہ تیرا یہی نام ہے۔ ادب سے کہا کہ اس گنہگار ہی کو عطاء اللہ کہتے ہیں۔ بے شمار دعائیں دیں کہنے لگی کہ اس بوڑھی جان کے ساتھ سونگڑوں نفل پڑھ کر تیرے لئے دعائیں کی ہیں کہ اے خدا اس نے تیرے حبیب کے ناموس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے یہ حق کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کو سلامت رکھنا۔ اس کو دشمنوں پر فتح نصیب کرنا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میں اس کیفت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے کرم کے انداز ہیں۔

شاہ جی کی صحبتوں کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے چراغ روشن کرتا رہا۔ شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ مذہب کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے۔ سیاست کے عروج و زوال کی داستانیں سنیں، بزرگوں کے روحانی درجات کے واقعات نے ذہن میں اجالا کیا۔ علمائے کرام کے تقویٰ، پرہیز گاری، ان کے علمی مقامات اور ان کی بے لفسی و خدا ترسی کے بہت سے قصے سنے۔ ملتان کے دو سال کے قیام کے دوران دل و نظر کی تربیت کے بے شمار مواقع میسر آئے۔

کالج کا نوجوان طبقہ شاہ جی سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ پروفیسر صاحبان کالج کے طلباء اور نوجوان اکثر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز منفرد تھا وہ نوجوانوں پر کفر کے فتوے لگانے، انہیں مذہب سے دور رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ نوجوان شاہ جی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے۔ حالات حاضرہ پر باتیں ہوتیں۔ سیاست زیر بحث آتی۔ ملکی معاملات پر تبادلہ خیالات ہوتا۔

ایک روز اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ شاہ جی کالج کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے جہاں داڑھی رکھنا بہت مشکل ہے۔ شاہ جی نے داڑھی رکھنے کے جواز میں کوئی حدیث نہ پڑھی نہ ہی کلام پاک کی کسی آیت کی تلاوت کی۔ فرمایا "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ خالصہ کالج میں داڑھی رکھنا آسان ہے اسلامیہ کالج میں واقعی بہت مشکل ہے" اس جواب سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ انتہائی شرمندہ ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ جی ایسا جواب دیں گے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر

چکا ہوں۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز سب سے جدا تھا۔ یہ ان کی فراست اور حاضر جوابی کی دلیل تھی۔

شاہ نے ساری زندگی قصداً تصویر نہیں کھنچوائی جب جلسے میں کیمرہ مین سامنے آتا تو آپ چہرے پر کپڑا ڈال لیتے۔ مگر لوگ کسی نہ کسی طرح تصویر اتار لیتے۔ اس میں شاہ جی کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔

ایسے بہت سے پر لطف واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جو شاہ جی کے منفرد انداز کلام کے ضامن ہیں۔ اس مضمون میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

میرا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا۔ اکتساب فیض کا یہ سلسلہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ ایک روز جھنگ کے دورے پر تھا کہ شاہ جی کی علالت کی خبر سنی۔ شاہ جی کو فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ خبر ملتے ہی شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عصر کا وقت تھا۔ برادر محترم سید عطاء المحسن بخاری نے میری آمد کی اطلاع دی۔ شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ عرض کی "بے وقت حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر طبیعت پریشان ہو گئی مجھے معلوم ہے کہ یہ آپ کے اوراد و وظائف کا وقت ہے مگر مجھ سے رہا نہ گیا۔ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔" شاہ جی کی زبان پر فالج کا اثر تھا۔ رک رک کر گفتگو فرما رہے تھے۔ انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "انگلیاں کام نہیں کرتیں۔ وظائف کا تسلسل ٹوٹ چکا ہے۔ یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ صحت جیسی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس حال میں رکھے شکوہ کس کا کروں۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں نہیں کی۔ تین سو پینسٹھ دنوں میں چار سو تقریریں کی ہوں گی۔ اب اس نے اگر میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کا کیا قصور یاد رکھو اگر کوئی حکومت اپنی رعایا سے اچھا سلوک نہیں کرے گی تو رعایا ایک نہ ایک دن ضرور بغاوت کر دے گی۔ پھر جسم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میں نے اپنی رعایا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کے آرام کا خیال نہ رکھا۔ اس نے بغاوت کر دی"۔

اتنی مختصر سی گفتگو کے بعد شاہ جی تھک چکے تھے۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ اس دوران میری نظروں کے سامنے وہ تمام جلسے آ گئے جن میں شاہ جی کی سحر بیانی دیکھی تھی۔ انہیں دلوں کو مسخر کرتے اور دلوں پر قبضہ جماتے دیکھا تھا۔ ان جلسوں میں شاہ جی کی بے پناہ قدر و منزلت اور احترام دیکھا تھا۔ شاہ جی کو تلواروں کی سلامی دی جاتی۔ احرار کے خدام انہیں مارچ کرتے ہوئے جلسہ گاہ تک لاتے۔ شاہ جی کے جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی ہزاروں لوگ شاہ جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پنڈال شاہ جی زندہ باد مجلس احرار زندہ باد، امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے گونجتا رہتا۔ شاہ جی کی تقریر سننے کے لئے دوسرے شہروں سے لوگ گروہ در گروہ آتے۔ سینکڑوں لوگ میلوں پیدل سفر کر کے جلسے میں شریک ہوتے۔ تقریر سے گھنٹوں پہلے لوگ سٹیج کے قریب جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ تاکہ دوران تقریر شاہ جی کو دیکھ سکیں۔ مشتاقان دید ہمہ انتظار بنے شاہ جی کی جلسہ گاہ میں آمد کے منتظر رہتے۔ بیک وقت ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے استقبال کے لئے اٹھتیں۔ شاہ جی شاہانہ طمطراق کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے۔

شاہ جی نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ تقریر کا آغاز کیا۔ لاکھوں کے مجمع میں سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ علماء شاہ جی کی خطابت سے مسحور ہو رہے ہیں۔ انگریزی دان طبقہ الگ جھوم رہا ہے۔ شعروں کے برجستہ استعمال پر اہل

ذوق داد دے رہے ہیں۔ حفاظ اور قراء شاہ جی کی تلاوت پر قربان ہو رہے ہیں۔ ہر ایک کی جھولی بھری جا رہی ہے۔ ہر ایک کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم ہو رہا ہے۔ ہر ایک علم کے خزانے سے دامن بھر رہا ہے۔ خطابت دلوں کے تاروں کو ہلاتی اور ذہنوں کو شاداب کرتی چلی جا رہی ہے۔ مجمع دنیا و مافیہا سے بے خبر ہمہ تن گوش تقریر کے حسن میں کھویا ہوا ہے۔ ہزاروں نگاہیں شاہ جی کے چہرے پر جمی ہیں۔ شاہ جی کی سحر بیانی اور آتش نوائی زوروں پر ہے۔ شاہ جی موضوع کی مناسبت اور موقع کی مطابقت سے قرآنی آیات وجد آفریں قرأت کے ساتھ تلاوت فرما رہے ہیں۔ تقریر کے دوران فارسی اور اردو کے اشعار روحوں کو گرما رہے ہیں۔ شاہ جی اشعار اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ رہے ہیں۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ معانی و مطالب کی خود بخود وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ الفاظ موضوع کے لحاظ سے تقریر کا حصہ بن گئے۔ ہزاروں کے مجمع میں سانس تک کی آواز نہیں ایک ہی آواز ہے جو دلوں کو گرماتی، روحوں میں سماتی جا رہی ہے۔ شاہ جی لوگوں کے چہروں سے عنوانات چن رہے ہیں ان کا ہاتھ لوگوں کی نبضوں اور دھڑکتے دلوں پر ہے وہ بے پناہ ہجوم کا دھارا جس طرف چاہتے ہیں موڑتے جاتے ہیں۔ مخالفین کی زبانوں سے واہ واہ کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مخالفین اپنی مخالفت بھول گئے۔ معتقدین ایثار کے پیکر، خلوص کے مجسمے اور فدائیت کا نشان بنے بیٹھے ہیں۔ یہ مرد مجاہد، یہ بے لوث انسان، یہ خطیب اعظم اپنے مخصوص انداز میں خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ اپنے فرض سے سرخرو ہو رہا ہے۔ حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ دینِ خدا کا سپاہی ان سب طاغوتی طاقتوں سے تن تنہا نبرد آزما ہے۔ اس کو کسی طاقت کی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے شاہ جی کے بارے میں کہا تھا۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

شاہ جی کی تقریر میں جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا۔ شاہ جی کے الفاظ میں شبنم کی نرمی، شاخِ گل کی لچک، بلبل کا زمزمہ، ستاروں کی چمک اور بہاروں کا حسن تھا۔ اگر شاہ جی کی زبان پر خدا اور رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کا ذکر ہوتا تو شاہ جی کی تقریر میں بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سمندر کا خروش، شاہوں کا جلال اور مرد مجاہد کی شان نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ موضوع کے مطابق لب و لہجہ اور انداز بیان بدل لیتے تھے۔ اور تقریر کو انتہائی موثر بنا لیتے تھے۔ الفاظ ہیں کہ پرے باندھے چلے آ رہے ہیں۔ دریا ہے کہ بہاؤ پر ہے۔ سمندر ہے کہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور اس سمندر کی ہر موج دلوں اور ذہنوں کو بہائے لئے جا رہی ہے۔ فرط جذبات سے لوگ مشتعل ہو رہے ہیں اور ہر دس پندرہ منٹ بعد فلک شگاف نعروں کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد امیر شریعت زندہ باد۔

میں ان فضاؤں میں کھویا ہوا تھا اس دور کو تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ان درخشاں تصورات کا سلسلہ شاہ جی کی مدھم آواز نے توڑا تمام منظر کے تمام نقشے، تمام ہنگامے آن واحد میں غائب ہو گئے۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا میں نے اس سحر بیان مقرر، شیریں مقال خطیب، شعلہ نوا اور آتش بیاں عالم دین

کو اس حالت میں دیکھا جس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ جس کی زبان سے بمشکل گفتگو ہو رہی تھی۔ جس کے قوائے ذہنی و جسمانی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کی بینائی دھندلا چکی تھی۔ جو ایک خستہ و شکستہ مکان میں رہتا تھا۔ جس کی دینی وملی خدمات کا صلہ عزلت و تنہائی اور جدوجہد آزادی کا انعام مسلسل پریشانی اور کسمپرسی تھا۔ جس کی صحت جو کبھی قابل رشک تھی۔ آج وہ اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا۔ آج اس کے جوڑ جوڑ اور نس نس میں نصف صدی کی تکان اور مشقت بسی ہوئی تھی۔ جس کا ذہنی اثاثہ کافی حد تک لٹ چکا تھا۔ جس کا جسمانی سرمایہ آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔ میری نظروں میں ماضی کی درخشاں تصویر حال کے بوسیدہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ چوکھٹا کتنا دیمک خوردہ تھا۔ کتنا بے رنگ و بے آب تھا۔ یہ حال کا چوکھٹا ماضی کے تابندہ و درخشاں نقوش پر اپنا گہرا سایہ ڈال رہا تھا۔

تحیر کی اس زنجیر کو پھر شاہ جی کی آواز نے توڑا۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام شروع کیا اور لمبی آہ بھر کر فرمایا۔ "یادداشت کافی حد تک جواب دے چکی ہے۔ بات کرتے کرتے بھول جاتا ہوں جب کوئی بات یاد نہ آئے تو بہت پریشانی ہوتی ہے" میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ میں شاہ جی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنا عظیم المیہ ہے۔ کتنا اندوہناک واقعہ ہے۔ وہ شخص جس کے ذہن میں سینکڑوں احادیث پورا کلام پاک اور بیشمار عربی، فارسی اور اردو کے اشعار تھے اور وہ قدرت کے اس عطیے سے جب چاہتا تھا جس وقت چاہتا تھا حافظے کی قوت اور یادداشت کے سہارے استفادہ کر سکتا تھا۔ آج وہ شخص بات تک یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس کے دل و دماغ پر کیا قیامت گزرتی ہو گی۔ آج وہ گفتگو کرنے سے عاجز ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ملتان کے ایک کوچے میں زندگی کے المیے کی تصویر بنا ہوا ہے۔ جس کی محفلیں ہر ذوق کے انسان کے لئے انمول سرمایہ ہوا کرتی تھیں آج وہ خود دوستوں کی محفلوں کو ترس گیا ہے۔

ایک بار شاہ جی نے ایک نشست کے دوران فرمایا تھا "حافظ جی یہ کوئی زندگی ہے یہ تو زندگی کا ماتم ہے۔ گزری ہوئی زندگی کا مرثیہ ہے۔ میری زندگی مسلسل نوحہ بن کر رہ گئی ہے"۔ پھر فرمانے لگے کہ "زندگی کا بیشتر حصہ علماء کی صحبت، شعراء کی مجالس اور، بزرگوں کی خدمت میں بسر ہوا۔ پیر مہر علیؒ شاہ نور اللہ مرقدہ کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ حضرت اقدس حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ العزیز کی باطنی توجہ سے قلب و روح میں اہتزاز پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ علیہ کے علمی وادبی خزانے سے مستفیض ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک عمر رفاقت رہی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی زندگی کے ساتھی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے جید علماء کی صحبتیں نصیب رہیں۔ ان میں سے اکثر داغ مفارقت دے گئے۔ یہ بزرگ علم و عمل کے پیکر، زہد و تقویٰ کی تفسیریں اور تبلیغ دین کے علمبردار تھے۔ یہ لوگ جہاں دین کے داعی تھے وہاں جدوجہد آزادی کے رہنما بھی تھے۔ ادیبوں اور شاعروں میں ایم ڈی تاثیر، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عابد علی عابد، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، پطرس بخاری میری مجلسوں کی زینت میری ادبی محفلوں کی رونق تھے علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان میں سے بھی اکثر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جو موجود ہیں ان کی صورت دیکھے برسوں گزر جاتے ہیں۔ عبدالمجید سالک تو میرے جیل کے ساتھی تھے۔ ایسے ہی رفیقوں کے سہارے جیل انجمن یاراں بنی رہی۔ فرمایا کہ ایک دفعہ صوفی تبسم جیل میں ملنے آئے عبدالمجید سالک سے مل کر چلے گئے۔ مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے لئے ایک شعر چھوڑ گئے۔ میں نے عرض کی اگر شعر حافظے میں موجود ہو تو سنائیے پھر شاہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھا۔

حیف کہ من بخوں تپم از تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری

فرمایا یہ غالب مرحوم کا شعر ہے اسی غزل کا مطلع ہے۔

دیدہ وراں کہ تانہد دل بشمار دلبری
گر رگ سنگ بنگرد رقص بتان آذری

دکھ بھرے لہجے میں فرمایا۔ وہ صحبتیں خواب ہو کر رہ گئیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ خواب تھے کہ بکھر گئے اس سینے میں کن کن صحبتوں کے داغ ہیں۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

حافظ صاحب اب تو اس محلے میں رہتا ہوں جہاں کوئی اخبار پڑھ کر بھی نہیں سنا سکتا۔ میری بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ آپ آجاتے ہیں تو بھولی بسری صحبتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لاہور سے کوئی دوست آجائے تو ماضی جگمگانے لگتا ہے۔ کمزوری اور نقاہت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ ذیابیطس سے جسم گھل کر رہ گیا ہے۔"

ایسی کئی محفلوں کے نقوش ذہن میں تازہ ہیں۔ کن کن صحبتوں کا ذکر کیا جائے۔ کن کن لمحات کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔ کن کن واقعات کو دہرایا جائے۔ شاہ جی کی صحبتیں میرے لئے کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ جن کے ایک ایک ورق میں علمی وادبی خزانے محفوظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی، صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جاں نثاری کے واقعات شعرائے کرام کے تذکرے، بذلہ سنجی، خوش مذاقی، انقلاب زمانہ کی ہولناک تصویریں، دیمک خوردہ خاکے ماضی کے تابندہ نقوش، حال کی شکستہ زندگی قید و بند کی جاں سوز حکایتیں۔ ان مجالس میں شاہ جی نے کس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا۔ کونسا وہ خزانہ نہ تھا جس کی کلید شاہ جی کے پاس نہ تھی۔ ایک شخص کے ہزار رخ ہزار جلوے تھے مگر اس دینی سیاسی علمی پیکر کو مسلسل بیماری نے نحیف و نزار کر دیا تھا۔ اب اس کے ذہن میں ہنگاموں اور معرکوں کے دھندلے خاکے بھی نہیں تھے۔

عید کا روز تھا شاہ جی غسل خانے سے وضو کر کے نکلے غسل خانہ جس میں ایک آدمی اچھی طرح بیٹھ کر وضو بھی نہیں کر سکتا۔ جس کا دروازہ نہیں تھا۔ دروازے کی جگہ پردہ لٹکا ہوا تھا۔ غلطانے سے نکل کر مجھے افسردہ دیکھا "فرمایا کیوں پریشان ہو" میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آپ نے یہ شعر سنایا۔

نہ گنجم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

میں شاہ جی کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ شعر کون پڑھ رہا ہے وہ شخص جس نے بے شمار ویران دلوں کی آبیاری کی جس کے سائے میں ہزاروں لوگوں کو آسودگی نصیب ہوئی۔ جس نے لاکھوں دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی جس نے ان گنت لوگوں کو دین کا درس دیا۔ اللہ اکبر کیسا حیرت کن انقلاب تھا۔ جس کے تصور سے روح کے تار لرزنے لگتے ہیں۔

شاہ جی کا ذاتی کتب خانہ فسادات کی نذر ہو گیا بہت سے قلمی نسخے ضائع ہو گئے۔ قیمتی دولوین اور سینکڑوں اشعار کا خوبصورت انتخاب امر تسر رہ گیا۔ جو عمر بھر کے ذوق کا ادبی سرمایہ تھا۔ اس علمی خزانے کے لٹ جانے سے شاہ جی پر کیا بیتی ہو گی۔ اس کا اندازہ ادب سے شغف رکھنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔

ایک دن فرمایا کہ آج کل نوجوانوں میں فارسی ادب کا ذوق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اسی لئے صحیح ادبی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مولانا غلام قادر گرامی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبتوں کا ذکر کرنے لگے۔ مولانا گرامی رحمتہ اللہ علیہ کے معراج کے واقعہ پر لکھے ہوئے اشعار سنائے۔ فرمایا "یہ اشعار مولانا گرامی ہی کا حصہ ہیں" صوتی آہنگ، تکرار لفظی، حسن معنوی، انتخاب الفاظ اور پھر شاہ جی کے پڑھنے کا دلکش انداز۔ عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔

بلا در ہر شکن پیچیدہ زلف نیم تابش را
اجل دریک گریبان ست چشم نیم خوابش را
شبے در خانہ زیں آں لمام انبیا آمد
قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
قضا گیرد قدر گیرد ازل گیرد ابد گیرد
رکابش راعنانش راعنانش را رکابش را
سوار برق شدما ہے فلک آمد عناں گیرش
رکابش بوسہ برپا زد ملک بوسد رکابش را
گرامی در قیامت آں گناہ مغفرت خواہد
کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را

فارسی ادب کا بہت دیر تذکرہ رہا۔ شاہ جی نے اس روز مستقد مین شعراء کے بہت سے اشعار سنائے۔

شاہ جی باتوں باتوں میں ایسے جملے کہہ جاتے تھے جو ادب کی تاریخ ہوتے تھے۔ کتنے ہی جواہر پارے ہونگے جو ضبط تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔

ایک دفعہ حدیث کے بارے میں فرمایا" حدیث تو دعوے کی مثل ہے" ایک دن فرمایا" دوستی اور دشمنی کا ترازو تو صرف انبیاعلیہم السلام کے ہاتھ میں رہا ہے" مولانا محمد انور شاہ کاشمیری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں نہایت بلیغ جملہ ارشاد فرمایا۔ واقعہ یوں ہے کہ شاہ جی کسی جلسہ میں شرکت کے لئے گئے۔ سٹیشن پر لوگ ان کے استقبال کے لئے آئے کسی بزرگ نے شاہ جی سے درخواست کی کہ آج وہ علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ

کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں۔ ہماری نئی پود کو اپنے اکابرین کے بارے میں بھی علم ہونا چاہیئے۔ وہاں شاہ جی نے فرمایا کہ حضرت کے بارے میں کیا عرض کروں "صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا حضرت پیچھے رہ گئے" اس مختصر سے جملے میں حضرت محمد انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے اوصاف حمیدہ ان کے تقویٰ، ان کی بزرگی، ان کا جناب رسالت مآب سے عشق، ان کی اتباع سنت غرضیکہ خصائل و شمائل کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر اس کی تشریح کی جائے تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کی بات ہو رہی تھی شاہ جی نے وہ شعر سنائے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فکر کی معراج نظر آئے۔

وجدت العلم فی الاشراف عظماً
وفی الاجلاف مقبوحاً و ذماً
کماء المطرفی الاصداف دُراً
وفی فم الافاعی صارساً

میں نے شرفاء میں علم کو معزز پایا اور کمینوں میں ذلیل و خوار دیکھا۔ جیسے سواتی کا پانی سیپ کے منہ میں موتی اور سانپ کے منہ میں زہر۔

میں نے جب آخری بار شاہ جی کو دیکھا وہ صاحب کمال اور صاحب علم و فضیلت بزرگ نشتر کالج میں بے سدھ پڑا تھا جس کا وجود نصف صدی کی جدوجہد کی تاریخ تھا۔ جس نے اپنی سر بیانی ایثار و قربانی اور علم و فضل سے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ جس کے صدائے کلمتہ الحق سے اہل باطل کانپ اٹھتے تھے جس کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد، مستقل آزماشوں اور قید و بند کی صعوبتوں میں گزری مگر کسی امتحان کسی آزمائش میں اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

شاہ جی نے وطن کی آزادی کے لئے قابل رشک جوانی قربان کر دی اور ناموس رسول اللہ ﷺ کے لئے ساری زندگی۔ اس شخص کو نہ زنجیر و سلاسل کا خوف تھا نہ دار و رسن کا اس نے ظلم و استبداد کا عالی حوصلگی اور پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس نے کبھی اپنی قربانیوں کا صلہ نہیں چاہا۔ خلافت کے زمانے تھے لاکھوں روپے اکٹھے ہوئے عورتوں نے شاہ جی کی تقریر سے متاثر ہو کر زیورات سٹیج پر پھینک دیئے۔ اگر شاہ جی چاہتے تو اپنی ذات کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کی بے لوث اور پر خلوص زندگی نے دنیوی آرام و آسائش کو قبول نہیں کیا۔ شاہ جی کو قدرت نے حسن کلام اور حسن خطابت کا جوہر عطا فرمایا تھا۔ وہ زندگی کی اعلیٰ ترین آسائشیں حاصل کر سکتے تھے مگر اس مرد قلندر اس فرشتہ سیرت بزرگ نے آخرت کے لئے سرمایہ اکٹھا کیا وہ مطمئن تھا کہ اس نے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ بر سر عام حق بات کہی۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ وطن سے محبت کی، آزادی کا علم بلند کیا۔

آج وہ مرد درویش، خطیب اعظم، شعلہ بیان مقرر، عاشق رسول اللہ ﷺ آزادی کا بیباک اور نڈر سپاہی دین کا مبلغ اپنا فرض ادا کر کے زیر زمیں آسودہ خاک ہے۔

وے لوگ تو نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے